AMJRT 1:1 (2019) pp. 22-36 ISS No: 2663-4392

فلسفۂ اخلاق کی تشکیل نو اور سیرت طیبہ میں اس کی نظریاتی بنیادیں

Reformation of Moral Philosophy and its Foundation in Seerah of the Prophet Muhammad(ﷺ)

حافظ محمد شارق *

Abstract

Though, the twenty first century is passing through a great development in the field of science, intellect, education and technology, human beings seem spiritually and ethically in a more miserable condition day by day. We observe inflation in the problems and complications regarding their solutions in human societies with every passing day. Today's man is highly engaged in universe and its enquiry, we are developing knowledge and physical efforts for taking control over all phenomena of universe, but in this effort, we lost our capability of good values and ethics mostly. In such conditions, the one and only personality, the Ambassador of peace, beloved Muhammad ﷺ is the source of guidance, by whom the spirit of a man could meet with peace and stability. But the solution of this major problem never can be just adopting his ethical teachings and the rejection of bad actions. If so, then the thousands of past writings about the issue have brought the revolution already on the face of the earth. Modern philosophy of ethics and Morality is based upon the concept of relativity as "Good" or "bad" is not universal truth at all. For this reason, it is less effective in terms of practicality. The roots of philosophical concepts we find in the teachings of Prophet's Muhammad (ﷺ). Have no enigmas and ambiguity Morality. Promoting the prophetic philosophy of Ethics and Morality can change the behavior of man automatically rather than forcefully. In this article, effort has been made to critically analyze the modern Moral philosophy in the light of Sīrah of the Holy Prophetﷺ. Analytical and critical research methodology is adopted in this study.

Keywords: Refirmatin, Morality, Modern Ethics, Prophet's Sīrah, Ethical Relativism

*Lecturer, Federal Urdu University of Science & Technology Karachi, hmshariq@gmail.com.

تعارف

انسانی اپنی فطرت کے ہی اعتبار سے ایک ایسی مخلوق ہے اور وہ کبھی بھی تنہا زندگی بسر نہیں کر سکتی۔ انسان جب پیدا ہوتا ہے تو وہ ایک ناتواں وجود ہے جسے پرورش کے لیے خاندان اور افراد کی ضرورت ہوتی ہے، سماجی تعلقات کی یہ احتیاج محض بچپن کی مجبوری نہیں بلکہ آخری لمحے تک کی ضرورت ہے۔ انسان دنیا میں رہتے ہوئے اپنی خواہشات اور مفادات کے بارے میں بھی سوچتا ہے اور لوگوں سے تعامل بھی کرتا ہے۔ یہ بھی ذہن نشین رہے کہ اسے ارادہ و اختیار بھی حاصل ہے، چنانچہ بہت سی صورتوں میں اس کی خواہشات یا رویہ سماج کے دیگر افراد کے ہم آہنگ نہیں ہوتیں۔ ایسے میں لازم ہے انسان کے پاس ایک ضابطہ موجود ہو جس کی روشنی میں وہ یہ طے کر سکے کہ اسے معاشرے میں کس طرح دوسروں سے ہم آہنگ زندگی بسر کرنی ہے۔ انسانیت کا یہی تقاضا ضابطہ اخلاق کی صورت میں ظہور پذیر ہوتا ہے۔ کسی سماج میں اگر اخلاق ناپید ہو جائیں تو وہ معاشرہ انتشار اور تباہی کا شکار ہو جاتا ہے جبکہ اخلاقی اعتبار سے بلند معاشرے دنیا و آخرت میں کامرانی کا ضامن ہوتے ہیں۔ اخلاق کی اسی اہمیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے قدیم زمانے سے ہی اس موضوع پر غور و فکر کیا جاتا رہا ہے۔ زمانہ قدیم سے آج تک اخلاقیات کے سینکڑوں فلسفے پیش کیے جا چکے ہیں جن میں بہت گردشِ ایام کی نذر ہو چکے ہیں جبکہ بہت سے نظریات آج بھی زندہ ہیں۔ اس تحقیقی مضمون میں ہم جدید اخلاقی نظریات کا تجزیاتی مطالعہ کریں گے اور ساتھ ہی یہ دیکھیں گے کہ ہمیں فلسفہ اخلاق کے بارے میں سیرت سے کیا تعلیمات واصول مل سکتے ہیں۔

اخلاق کے معنی و مفہوم

لفظ اخلاق عربی میں خُلق سے بنا ہے۔ خلق کے معنی اخلاقی کردار یا فطری رجحان ہے۔ اس کی جمع اخلاق ہے ابن منظور لکھتے ہیں:

وَهُوَ الدّين والطبع والسجية وحقيقتة انة لصورة الانسان الباطنة وهى نفسة واوصافها ومعانيها المختصة بها[1]

خلق کے معنی دین، طبیعت اور انسان کی اندرونی کیفیت ہے۔ اور اس کو اس کی تمام صفات اور مخصوص معنی میں مثلاً اس کی ظاہری شکل و صورت خلق کہلاتی ہے۔

[1] عبداللہ عباس ندوی، **قاموس الفاظ القرآن الکریم (عربی۔اردو)**، مترجم: عبدالرزاق (کراچی: دارالاشاعت، 2003ء)، 115؛ **محمد بن مکرم ابن منظور**، **لسان العرب**، (بیروت: داراحیاالتراث، 1414)، 10:84-85۔

اسی سے ملتا جلتا لفظ خَلق بھی ہے جس کے معنی ظاہری شکل وصورت ہیں۔ قرآنی عربی کے ماہر امام راغب دونوں میں اس طرح سے فرق بیان کرتے ہیں:

خُصّ الخلق بالهيئات والاشكال والصور المدركة بالبصر و خصّ الخلق بالقوى والسجايا[2]

خلق ہیت وشکلِ انسانی کے ساتھ خاص ہے اور محاسن خلق کا مشاہدہ نگاہ کرتی ہے اور خلق کے معنی عادت اور خصلت دونوں ہیں۔

انگریزی میں اخلاق کے لیے بہتر لفظ Morality ہے۔ یہ لفظ Mores سے نکلا ہے جس کے معنی کردار اور طور طریقے کے ہیں۔[3] معروف انگریزی لغت Merriam Webster میں Moral کے ایک معنی یہ درج ہیں:

"Principles of right and wrong in behavior."[4]

اصطلاحی معنوں میں خلق سے مراد یہ ہے کہ انسان کی طبعی خصلت وعادت ہے چاہے اچھی ہو یا بری۔ اپنی مشہور زمانہ کتاب احیاء العلوم میں امام غزالی لکھتے ہیں:

فالخلق عبارة عن هيئة فى النفس راسخه عنها تصدر الأفعال بسهولته ويسرمن غير حاجته الى نكرو روية ۔[5]

خلق نفس کی ایک ایسی کیفیت اور ہیئت راسخ کا نام ہے جس کی وجہ سے سہولت فکر اور توجہ کے بغیر نفس کے اعمال صادر ہو سکیں۔

علم الاخلاق کی تعریف میں ارسطو کہتا ہے: "جس علم میں انسانی کردار پر اس حیثیت سے بحث کی جائے کہ وہ صواب و خیر ہیں یا خطاء وشر اور اس طرح بحث کی جائے کہ یہ تمام احکام صواب و خیر اور خطاء وشر کسی مرتب نظام کی شکل میں آجائیں تو اس علم کو علم الاخلاق کہتے ہیں۔"[6]

اخلاقی نظریات کی تاریخ

انسانی شعور میں اخلاق کا تصور روزِ اول سے ہی موجود ہے جب سے انسان نے معاشرتی زندگی کا آغاز کیا۔ سیدنا آدم اور حوا علیہما السلام کا واقعہ اور اس کے ہابیل و قابیل کا واقعہ دنیا بھر کے مذاہب میں ناموں کی تبدیلی اور معمولی اختلافات

---

[2] راغب اصفہانی، **المفردات فی غریب القرآن** (دمشق: دار القلم، 1412ھ)، 1:297۔

[3] Paul W. Diener, *Religion and Morality: An Introduction,* (Louisville: Westminster John Knox Press, 1997), 9.

[4] "Morality" ،Merriam-Webster, accessed January 20, 2018, https://www.merriam-webster.com/dictionary/morality.

[5] ابو حامد محمد بن محمد الغزالی، **احیاء علوم الدین** (مصر: مطبعہ مصطفی البابی الحلبی، 1939ء)، 3:52۔

[6] حفظ الرحمٰن سیوہاری، **اخلاق و فلسفۂ اخلاق** (لاہور: مکتبہ رحمانیہ، 1974ء)، 2-3۔

(Variations) کے ساتھ موجود رہا ہے جس میں اچھائی اور برائی کی معرکہ آرائی بالکل واضح پر دکھائی دیتی ہے۔ یہ اس بات شہادت ہے کہ خیر و شر کا تصور آغازِ انسانیت سے ہی موجود رہا ہے۔ ہمیں مختلف مذاہب کی اساطیری روایات میں اخلاقی پہلوؤں کی نشاندہی ملتی ہے لیکن اخلاق بطور علم اور معاشرتی قدر کے طور پر اسے مستحکم کرنے اور اس کی فلسفیانہ بنیادیں کھڑی کرنے کا سہرا یونانیوں کے سر جاتا ہے۔یونانیوں کے ہاں ساتویں سے چھٹی قبل مسیح میں ایسے حکیمانہ اقوال واشعار بکثرت ملتے ہیں جو انسانی کردار اور اخلاقیات پر بحث کرتے ہیں،[7] ان میں ہر قلیطوس،ڈیماقریطوس اور فیثاغورث خاص طور پر شامل ہیں جنھوں نے اپنی مادی فلسفے کے ہی ضمن میں اخلاقیات پر بھی مختصر بحث کی ہے۔ البتہ اخلاقی مباحث پر رد و قدح کا باقاعدہ آغاز سقراط کے زمانے سے ہی ہوتا ہے۔ سقراط پہلا فلسفی تھا جس نے اخلاقی موضوعات کو سائنسی اور علمی انداز میں پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی، لیکن اس نے اخلاق بطور علم متعارف نہیں کروایا تھا۔ ارسطو وہ پہلا شخص تھا جس نے اس موضوع پر کتاب لکھ کر ''علم الاخلاق'' کی باقاعدہ بنیاد رکھی۔ اس کے بعد یونانیوں نے اس سلسلے کو جاری رکھا اور علم الاخلاق پر کئی اہم مباحث سامنے آئے۔ البتہ یہ واضح رہے کہ یونان میں تشکیل پانے والا علم الاخلاق مکمل طور پر غیر الہامی بنیادوں پر استوار تھا لہٰذا تصور اخلاق کی نظریاتی تشکیل خالصتاً فلسفیانہ بنیادوں پر ہوئی جو صرف مادی نقطہ نظر کی ہی حمایت نہیں کرتی بلکہ بہت سے سوالات کے متعین جوابات بھی نہیں دے سکتی ۔یونانیوں کے بعد مسلم فلاسفرز نے اس موضوع کئی اہم تصانیف لکھی۔ ان میں فارابی، ابن سینا اور ابن مسکویہ کا نام نمایاں طور پر شامل ہے۔تاریخِ اخلاقیات میں اس مسلم روایت کا خاصہ یہ ہے کہ اسے حتی الامکان الہامی بنیادوں پر اس طرح سے تشکیل دینے کی کوشش کی گئی کہ یہ نظام میزانِ عقل پر بھی ثابت ہوسکے۔ آخر میں نشاۃ ثانیہ کا دور آتا ہے جس میں مختلف فلسفیوں نے اخلاقیات کے بارے میں خیر و شر کے عنوان سے اپنے اپنے افکار پیش کیے۔ ان میں فرانسس بیکن، ہابس، سپینوزا، کانٹ اور سپنسر کا نام نمایاں ہے۔

ہم عصر اخلاقی نظریات کا تنقیدی جائزہ

موجودہ اخلاقی نظام جو دنیا پر غالب ہے، وہ دراصل قدیم یونانی افکار اور نشاۃ ثانیہ کے فلسفیوں کے افکار کا مرکب ہے۔ اس فلسفہ اخلاق میں مقصود انسان کا مادی ارتقا ہے اور نفس کو جھکانا اس فلسفہ اخلاق میں انتہائی معیوب سمجھا جاتا ہے۔ ہم عصر فلسفہ اخلاق یہ اضافیت (Relativity) اور انسان پرستی (Humanism) پر مشتمل ہے۔

---

[7] سید احمد عروج، **قرآن کا فلسفہ اخلاق** (دہلی: مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، 2014ء)، 28۔

اضافیت (Relativism) کے معنی یہ ہیں ایک شے کی حقیقت کا تعلق دوسرے امور پر منحصر ہو۔ سوفسطائی فلسفے میں اس مراد یہی تھی کہ دنیا کے تمام حقائق، خواہ وہ علم ہو یا خیر و شر، ان کے بارے میں کچھ بھی قطعیت کے ساتھ نہیں کہہ سکتے بلکہ یہ ہر فرد خود اپنی رائے رکھ سکتا ہے۔ دورِ حاضر کے اجتماعی نظام میں اس فلسفے کو روح کی حیثیت سے تسلیم کر لیا گیا ہے جس کے مطابق کے نزدیک حقیقت اور علم کا حال یہی ہے کہ ہر شخص کے لیے مخصوص حالات میں مخصوص شے صداقت ہوتی ہے۔ لہٰذا جدید فلسفیوں کے نزدیک خیر و شر کے اصول ازلی نہیں ہیں بلکہ معاشرتی اور سماجی حالات کے مطابق یہ اصول تغیر پذیر ہوتے ہیں۔ مخصوص حالات میں ایک فعل اچھا سمجھا جائے گا لیکن مختلف حالات میں وہی فعل برا سمجھا جائے گا۔ اس طرح قانون کا ایک اجتماعی تصور جو سب کے لیے یکساں طور پر درست ہو، بالکل ہی بے معنی ہو کر ختم ہو جاتا ہے۔ فلسفہ میں یہ اضافیت اخلاق کے میدان میں ایک عظیم المیہ کا سبب بنتی ہے کہ اچھائی اور برائی کوئی بھی اپنی اصل میں حقیقت نہیں رکھتی، لہٰذا اس کے لیے کوئی بھی معیار بھی قائم نہیں کیا جا سکتا۔ ہر شخص کا معیار ہی مختلف ہے تو پھر کیونکر انھیں ایک متفقہ لگے بندھے قانون میں باندھا جا سکتا ہے؟

چنانچہ سولہویں صدی کا مشہور فلسفی تھامس ہابس یہی کہتا ہے کہ کوئی بھی چیز خیر مطلق یا شر نہیں ہے، بلکہ خیر و شر نسبتی اور اضافی قدریں ہے۔ اس میں نہ صرف زمانہ کے ساتھ تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے بلکہ ہر انسان کے نزدیک بھی اس کا معیار بدلتا رہتا ہے۔[8] اخلاقیات میں اضافیت کی پیدا کردہ اسی صورت حال کے بارے میں مشہور ماہر عمرانیات رابرٹ بریفالٹ یہ کہنے پر مجبور ہے کہ ''اخلاقی فیصلوں میں ہمارا یقین و اعتماد آج کل بری طرح متزلزل ہو چکا ہے۔ کوئی ''مطلق قطعیّت'' قابل یقین نہیں سمجھی جاتی۔''[9]

جدید فلسفہ اخلاق کا دوسرا ستون انسان پرستی ہے۔ ہیومن ازم یا انسان پرستی سے مراد وہ فلسفہ ہے جس میں "انسان" بحیثیت آزاد فرد اور کائنات کی ایک اکائی کے، ہر اصول و قاعدے اور معاملات میں معیارِ حق ہے۔'' ہیومن ازم سے مراد اُن کلیات و نظریات جو تمام معاملات میں کسی بھی آسمانی یا مافوق الفطرت ہدایت کے بجائے انسان کو ہی اہمیت دے۔ اس کی ایک واضح مثال ہو سکتی ہے۔ اگر انسان یہ چاہے کہ شراب و زنا حلال ہونی چاہیے تو پھر یہ اس کا بنیادی حق ہے کیونکہ اس حق کی تکمیل میں اسے تسکین اور لذت ملتی ہے۔ غرض کہ ہر معاملے میں انسانی نفس کی چاہ پورا کرنا ہی ہیومن ازم ہے۔ اس فلسفے کو سمجھنے

---

[8] امین احسن اصلاحی، **فلسفے کے بنیادی مسائل قرآن کی روشنی میں** (لاہور: فاران فاؤنڈیشن، 2013ء)، 105۔

[9] رابرٹ بریفالٹ، **تشکیل انسانیت**، مترجم: عبدالمجید سالک (لاہور: مجلس ترقی ادب، لاہور، 1994ء)، 352۔

کے لیے ہمیں ماضی کے دریچوں میں جھانکنا پڑے گا جہاں سے انسان پرستی کا آغاز ہوتا ہے۔ یونان کے فلسفی پروٹاگورس کا مشہور مقولہ تھا کہ فرد ہی ہر شے کا پیمانہ ہے۔.Man is the measure of all things- یہاں Man سے مراد ہر شخص کی انفرادی ذات ہے۔ یعنی کسی بھی گروہ کے اجتماعی ضمیر و شعور یا وحی جیسی خارجی ہدایت کو حق کا معیار تسلیم نہیں کیا جائے گا، نہ ہی ہم دوسرے کا معیار خود کے لیے درست سمجھیں گے، بلکہ آدمی کے لیے صداقت اور حقیقت کا پیمانہ وہ خود ہو گا، اس کی ذات کا تحفظ اور بے قاعدہ لذت کا حصول اور آسائش پانا ہی تمام قوانین اور اصولوں کا محور ہونا چاہیے۔ جب ہم یہ اصول تسلیم کر لیتے ہیں تو وہ حرمتوں کے وہ تمام پیمانے بے معنی ہو جاتے ہیں جن کا سرچشمہ آسمانی ہدایت ہو اور وہ انسان کو کسی بھی لذت سے محروم کرنے کا ذریعہ بن جائے۔ چنانچہ ہم جنس پرستی کے بارے میں گو کہ تمام مذاہب متفقہ طور پر حرمت کا فتویٰ دیتے ہیں لیکن چونکہ یہ فرد کی آزادی اور حصول لذت پر قدغن لگاتی ہے اس لیے جدید فلسفہ اخلاق میں یہ سراسر خیر کا ہے۔ جدید فلسفہ اخلاق کی رُو سے انسان ہر وہ کوشش جو اپنی ہستی کی بقا اور تحفظ کے لیے کرتا ہے، فضیلت کا عمل (Virtue) ہے اور وہ تمام احساس جو انسان کو براہ راست دوسروں کے نقصان کے بغیر لذت (Joy) پہنچائیں وہ خیر ہے۔ کانٹ گو کہ یورپ میں مذہبی اخلاق کا بڑا داعی سمجھا جاتا ہے، وہ بھی ہیومن ازم کے اس اثر سے محفوظ نہ رہ سکا۔ ڈاکٹر نعیم احمد لکھتے ہیں کہ: "کانٹ کے نزدیک تمام لوگ فطری طور پر مسرت حاصل کرنے چاہتے ہیں۔ لیکن حصولِ مسرت میں انھیں دوسروں کی مسرت کا بھی احساس رکھنا چاہیے۔"[10]

ہم نے دیکھا کہ جدید فلسفہ اخلاق ایک جانب انسان کو اضافیت کی تشکیک میں مبتلا رکھتا ہے تو دوسری جانب اسی فعل کو خیر قرار دیتا ہے جو انفرادی و اجتماعی سطح پر مسرت کا باعث ہو۔ تاہم یہ سوال کہ اخلاقی اصول کس طرح تشکیل پاتے ہیں؟ انسانی نفسیات کے بارے میں اڈلر اور سگمنڈ فرائڈ کے نظریات اس ضمن میں ہمیں یہ بتاتے ہیں کہ اخلاقیات کی تشکیل دراصل ہماری فطری جبلّتوں کی تکمیل کی ضمانت اور معاشرے کے اتفاق رائے سے وجود پاتا ہے۔ چنانچہ کوئی شخص اگر اخلاقی قوانین کی پیروی کرتا ہے تو اس کے پس پردہ محرک تحفظ ذات اور مادی ارتقا ہے۔ اس تصور کے ساتھ جب عملی دنیا کا جائزہ لیا جائے تو یہی حقیقت کھلتی ہے کہ جو لوگ اس منشا کے مراحل طے کر چکے ہوں ان کے لیے اخلاقی اصول کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ یہی وجہ ہے کہ سرمایہ دار طبقہ اپنی سرمایہ کاری اور کاروبار کے لیے کسی بھی فضیلت یا اخلاقی اصول کی پیروی کو خلافِ فطرت سمجھتا ہے کیونکہ اس کے تصورِ اخلاق کی رُو سے مادی ترقی کے لیے سب کچھ جائز ہے۔

[10] نعیم احمد، تاریخ فلسفہ جدید (لاہور: علمی کتب خانہ، 1983ء)، 207۔

سیرت طیبہ میں اخلاق کی نظریاتی بنیادیں، عصری تناظر میں

پاکیزہ اخلاق کے حامل افراد کی تشکیل کے بغیر کوئی بھی سماج ترقی اور فلاح کی راہ نہیں پا سکتا۔ معاشرے کے افراد کی اخلاقی تربیت ہی سماج کے عروج و تنزل کے رخ کرتی ہے، اس مقصد کے لیے قرآن حکیم میں شریعت سے زیادہ اخلاقی موضوعات پر تفصیل موجود ہے۔ نیز سیرت طیبہ سے بھی ہمیں یہی پہلو نمایاں ملتا ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام محاسن اخلاق کی تعلیم و ترویج اور فروغ کو اولین ترجیح دی۔

موجودہ دور میں جو اخلاقی بحران ہم دیکھ رہے ہیں؛ اس کی بنیادی غلطی ہم اوپر واضح کر چکے ہیں اور اس کے نتائج بھی ہمارے سامنے ہیں کہ کس طرح نام نہاد "ایمانداری" کے ساتھ ایک اونچا طبقہ نچلے طبقے کو لوٹتا ہے اور دونوں ہی اس عمل میں کسی بھی درجے میں اخلاقی قباحت کو نہیں رکھتے۔ اس بحران کا واحد حل یہ ہے کہ ہم فلسفۂ اخلاق کو اُن بنیادوں پر استوار کریں جس کی زد میں وہ تمام برائیاں آسکیں جسے جدید فلسفہ اخلاق برائی تصور نہیں کرتا۔ اس ضمن میں ہمارے سامنے سب سے بہترین مشعلِ راہ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات ہیں۔ آپ علیہ السلام کا فرمان ہے کہ:

((إِنَّمَا بُعِثْتُ لِأُتَمِّمَ صَالِحَ الْأَخْلَاقِ))[11]

مجھے اچھے اخلاق کی تکمیل کے لیے مبعوث کیا گیا ہے۔

یعنی آپ کی بعثت کا مقصد ہی یہ تھا کہ آپ ﷺ لوگوں کی اخلاقی تربیت کریں اور وہ تمام اخلاقی رذائل ختم کر دیں جو انفرادی و اجتماعی سطح پر فساد اور شر کا باعث بنتے ہیں۔ قرآن مجید میں آپ ﷺ کے اخلاقِ حسنہ کے بارے میں ارشاد ہے:

﴿وَإِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ﴾[12]

بے شک آپ اخلاق کے اعلیٰ مرتبے پر ہیں۔

نبی کریم ﷺ کی سیرت کا یہ امتیاز ہے کہ آپ نے افراد کی تعمیر میں محض نیکی اور محاسن اخلاق کی تلقین کے ساتھ ساتھ اس کے لیے فکری بنیادیں بھی فراہم کیں۔ آپ ﷺ جانتے تھے کہ عمل سے پہلے فکری بنیادیں ہی ہوا کرتی ہیں جو معاشرے کی فلاح کا بربادی کا ضامن بنتی ہیں۔ اس سلسلے میں جب سیرت نبوی سے رہنمائی لینے کی سعی کی جائے تو ہمیں کچھ ایسے اخلاقی اصول ملتے ہیں جس کا اطلاق آفاقی طور پر کسی بھی زمان و مکان اور حالت میں ہو سکتا ہے۔ اگر ہم ان بنیادوں پر خیر و شر کا

---

[11] أحمد بن حنبل، **مسند أحمد بن حنبل**، باب مُسْنَدُ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ (بیروت: مؤسسۃ الرسالۃ، 1412ھ)، حدیث: 8952، 14:512۔

[12] القرآن 68:4

تعین کریں تو ہر فرد کے لیے اس کی اخلاقی حیثیت بالکل واضح ہو جاتی ہے۔ فلسفہ اخلاق کی تشکیل کے لیے سیرت طیبہ سے ہم جو اصول کشید کر سکتے ہیں وہ درج ذیل ہیں۔

عدمِ شر

دین اسلام سراسر امن اور سلامتی کا دین ہے اور یہ یہ سلامتی دنیاوی واخروی زندگی دونوں کے لیے ہے۔ سلامتی کے اصول کے خلاف کوئی بھی تعلیم ہو، اُس کا واسطہ اسلام سے ہر گز نہیں ہو سکتا۔ قرآن کریم بارہا نیکی کی تاکید کی گئی اور شر اور ضرر رسانی میں تعاون سے منع کیا گیا ہے۔[13] اسلامی تعلیمات میں امن و سلامتی پر اس قدر اصرار کیا گیا ہے رسول اللہ ﷺ نے مسلمان صرف اُسے کہا ہے جو شخص اپنی ذات میں خیر و سلامتی اور نفع بخش کا سبب ہو۔ ارشاد نبوی ہے:

((أَحَبُّ النَّاسِ إِلَى اللَّهِ أَنْفَعَهُمْ لِلنَّاسِ،۔۔۔))[14]

یہ حدیث مسلمانوں کو محض ایک اخلاقی تعلیم نہیں دے رہی، بلکہ یہ ایک اخلاقی اصول بھی بیان کر رہی ہے کہ کوئی بھی عمل خواہ قول سے کیا جائے یا فعل سے، اس کا حاصل اگر سلامتی کے بجائے شر انگیزی اور تکلیف ہو تو وہ عمل اخلاق اصولوں کے خلاف ہے۔ اگر زبان سے شر انگیزی میں وہ گناہ شامل ہوں گے جن کا تعلق انسانی قول سے ہوتا ہے مثلاً جھوٹ اور جھوٹی گواہی، غیبت، مذاق اڑانا، گالی دینا کرنا وغیرہ۔ کوئی بھی ایسی بات جس سے دوسرے انسان کو شر پہنچنے کا شائبہ ہو وہ اخلاقی طور پر درست نہیں ہو سکتی۔ قرآن مجید میں قول سے متعلق گناہوں میں دو گناہوں کا تذکرہ انتہائی سخت الفاظ میں کیا گیا ہے:

﴿وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولَئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُولًا﴾[15]

اور (اے انسان!) تم اس بات کی پیروی نہ کرو جس کا تمہیں (صحیح) علم نہیں ہے بیشک کان اور آنکھ اور دل ان میں سے ہر ایک سے باز پرس ہو گی۔

قول کی احتیاط کے بعد اس حدیث میں انسانی فعل کا ذکر ہے۔ یہ توقع کسی بھی مسلمان سے ہر گز نہیں کی جاسکتی ہے کہ اس کے ہاتھ سے دوسرے انسان کو کوئی بھی تکلیف آئے۔ اس اصول میں وہ تمام قواعد و ضوابط بھی آجاتے ہیں جو معاشرتی آداب اور عصری اصطلاح میں شہری فرائض (Civic Duties) کہلاتی ہیں۔ اس ضمن میں یہ واضح رہنا چاہیے کہ ہاتھ سے تکلیف

---

[13] القرآن 5:2

[14] سُلَيْمان بن أحمد الطَّبَرَاني، **معجم الاوسط** (القاہرہ: دار الحرمین، 2010ء)، حدیث: 4024، 4:139۔

[15] القرآن 17:34؛ القرآن 49:12

پہنچانے سے مراد محض کسی کو مارنا یا چوری کرنا نہیں بلکہ تمام اعمال شامل ہیں جس میں کسی بھی قسم کی ایذا رسانی کا شائبہ موجود ہو۔ چنانچہ غلط پارکنگ، ملاوٹ اور بہت سے جرائم اس میں شامل ہو جاتے ہیں۔اجتماعی سطح پر نقصان کی مثال ہمیں قرآن کے اس اسلوب سے بھی بخوبی ملتی ہے:

﴿مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ أَوْ فَسَادٍ ---------جَمِيعًا﴾[16]

جس نے کسی انسان کو خون کے بدلے یا زمین میں فساد پھیلانے کے سوا کسی اور وجہ سے قتل کیا گویا اس نے تمام انسانوں کو قتل کر دیا۔

قول و فعل میں عدم شر کا یہ اصول انتہائی وسیع اور ہر عمل پر قابل اطلاق ہے۔انسان کسی بھی کام کے بارے میں یہ فیصلہ کرنا چاہتا ہو کہ آیا کہ اخلاقی نقطہ نظر سے درست ہے یا نہیں تو اسے محض یہ طے کر لینا چاہیے کہ اس عمل کے نتائج میں شر انگیزی کا کوئی عنصر موجود نہ ہو۔

عدمِ نفاق

ہم یہ چلن بالکل عام دیکھتے ہیں کہ کوئی ملاوٹ کا مال بیچ کر خیانت کر رہا ہے تو کوئی جھوٹ بول کر گھٹیا مال مہنگے داموں میں بیچ رہا ہے۔کوئی شخص چاپلوسی سے منافقت کا اظہار کر رہا ہے تو کوئی جھوٹی شہادتوں کی بنیاد پر معاملات طے کر رہا ہے۔معمولی غور و فکر سے ہی یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ان سب کے پیچھے یہی برائی ہے کہ انسان حقیقتِ حال چھپا کر غلط بیانی کر رہا ہے۔اسی بالفاظ دیگر نفاق کہتے ہیں۔عدم صدق یا نفاق ظاہری و باطنی ہر ایک جہت پر محیط ہے۔

نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول حدیث میں کمالِ بلاغت کے ساتھ نفاق کو کئی برائیوں سے منسلک کیا گیا ہے اور اس اصول کی وضاحت کی گئی ہے:

((أَرْبَعٌ مَنْ كُنَّ فِيهِ كَانَ مُنَافِقًا خَالِصًا، وَمَنْ كَانَتْ فِيهِ خَصْلَةٌ مِنْهُنَّ كَانَتْ فِيهِ خَصْلَةٌ مِنَ النِّفَاقِ حَتَّى يَدَعَهَا: إِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ، وَإِذَا حَدَّثَ كَذَبَ، وَإِذَا عَاهَدَ غَدَرَ، وَإِذَا خَاصَمَ فَجَرَ))[17]

---

[16] القرآن 5:32

[17] محمد بن اسماعیل البخاری، الجامع الصحیح، كِتَابُ الإِيمَانِ، بَابُ عَلاَمَةِ المُنَافِقِ (ریاض: دارالسلام، 1428ھ)، حدیث: 34، 1:14۔

چار چیزیں ہیں: جس شخص میں وہ ہوں خالص منافق ہوتا ہے اور جس شخص میں ان خصلتوں میں سے کوئی ایک ہو اس میں نفاق کی ایک خصلت ہو گی یہاں تک کہ اسے چھوڑ دے۔ جب اسے امانتدار سمجھا جائے تو خیانت، جب بات کرے تو جھوٹ کہے، جب عہد کرے تو اسے توڑ ڈالے اور جب جھگڑے تو بدزبانی کرے۔

قرآن مجید میں صدق اور نفاق کے متعلق ارشاد ہے:

﴿لِيَجْزِيَ اللَّهُ الصَّادِقِينَ بِصِدْقِهِمْ وَيُعَذِّبَ الْمُنَافِقِينَ إِنْ شَاءَ أَوْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ إِنَّ اللَّهَ كَانَ غَفُورًا رَحِيمًا﴾[18]

یہ سب کچھ اس لیے ہوا) تاکہ اللہ سچوں کو اُن کی سچائی کی جزا دے اور منافقوں کو چاہے تو سزا دے اور چاہے تو ان کی توبہ قبول کر لے، بے شک اللہ غفور و رحیم ہے۔

ایک اور مقام پر ارشاد ہے:

﴿قَالَ اللَّهُ هَذَا يَوْمُ يَنْفَعُ الصَّادِقِينَ صِدْقُهُمْ لَهُمْ جَنَّاتٌ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ ذَلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ﴾[19]

اللہ تعالیٰ فرمائے گا: یہ ایسا دن ہے (جس میں) سچے لوگوں کو ان کا سچ فائدہ دے گا، ان کے لئے جنتیں ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہیں، وہ ان میں ہمیشہ ہمیشہ رہنے والے ہیں۔ اللہ ان سے راضی ہو گیا اور وہ اس سے راضی ہو گئے، یہی (رضائے الٰہی) سب سے بڑی کامیابی ہے۔

یہی تعلیم ہمیں احادیثِ نبوی سے بھی کثرت سے ملتی ہے کہ انسان کسی بھی موقع پر صدق کے خلاف کوئی عمل نہ کرے ورنہ اس کے لیے سخت وعید ہے۔ فرمانِ نبوی ہے:

((إِنَّ الصِّدْقَ يَهْدِي إِلَى الْبِرِّ، وَإِنَّ الْبِرَّ يَهْدِي إِلَى الْجَنَّةِ، وَإِنَّ الرَّجُلَ لَيَصْدُقُ حَتَّى يُكْتَبَ صِدِّيقًا، وَإِنَّ الْكَذِبَ يَهْدِي إِلَى الْفُجُورِ، وَإِنَّ الْفُجُورَ يَهْدِي إِلَى النَّارِ، وَإِنَّ الرَّجُلَ لَيَكْذِبُ حَتَّى يُكْتَبَ كَذَّابًا))[20]

---

[18] القرآن 33:24

[19] القرآن 5:119

[20] مسلم بن الحجاج القشيري، **الجامع الصحیح**، بَابُ قُبْحِ الْكَذِبِ وَحُسْنِ الصِّدْقِ وَفَضْلِهِ (بیروت: دار احیاء التراث العربی، 1997ء)، حدیث: 2407، 4:2012۔

بے شک سچائی نیکی کی طرف لے جاتا ہے اور یقیناً نیکی جنت کی طرف لے کر جاتی ہے اور وہ شخص جو سچائی پر (مستقل) عمل پیرا رہے وہ پھر اللہ کے ہاں صدیقوں میں لکھ لیا جاتا ہے اور جھوٹ بے شک برائی کی طرف لے جاتا ہے اور برائی یقیناً جہنم کی طرف لے جاتی ہے اور وہ شخص جو ہمیشہ جھوٹ بولتا رہے وہ اللہ کے ہاں جھوٹوں میں لکھ لیا جاتا ہے۔

ان آیات اور احادیثِ کثیرہ کی روشنی میں ہمیں فلسفہ اخلاق کے بارے میں جو دوسرا اصول ملتا ہے وہ عدم صدق ہے۔ یعنی خلاف حقیقت معاملہ نہ کرنا۔ کوئی بھی فرد کوئی بھی عمل کرتے ہوئے کہ یہ جانچ لے کہ آیا کہ بات یا عمل خلافِ حقیقت ہے یا حقیقت کے مطابق۔ اس سے اس کے خیر و شر ہونے کا باسانی فیصلہ کیا جاسکتا ہے۔

حب مال

معاشی خوشحالی ایک مومن کے لیے اچھی اور فطری چیز ہے۔ مال کے بارے میں سیرت طیبہ کی تعلیمات کا خلاصہ یہی ہے کہ اسلام میں مال کوئی بری شے نہیں بلکہ یہ اللہ کا فضل اور احسان ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مال کو مذموم یا ممنوع قرار نہیں دیا بلکہ یہ فرمایا کہ غربت و افلاس کفر تک لے جاسکتی ہے۔ اس لیے معاشی خوشحالی رکھنا ضروری ہے، لیکن آپ ﷺ نے مختلف مواقع پر یہ بھی واضح کیا معاشی خوشحالی کا کوئی ایسا راستہ اختیار کرنا جس سے کسی کی مجبوری کا فائدہ اٹھایا جائے، یا وہ عمل جس میں تمام دیگر پہلو چھوڑ کا مال حاصل کرنا ہی مقصود بالذات بن جائے درست نہیں۔ کیونکہ حب مال ایک برائی ہے جس کی مذمت قرآن مجید میں بھی انتہائی سخت انداز میں آئی ہے:

﴿أَلْهَاكُمُ التَّكَاثُرُ ۔ حَتَّىٰ زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ۔ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُونَ ---------- ثُمَّ لَتُسْأَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيمِ ۔﴾[21]

تمہیں کثرتِ مال کی ہوس اور فخر نے (آخرت سے) غافل کر دیا۔ یہاں تک کہ تم قبروں میں جا پہنچے۔ ہر گز نہیں! (مال و دولت تمہارے کام نہیں آئیں گے) تم عنقریب (اس حقیقت کو) جان لوگے۔۔۔۔ پھر ضرور اُس روز تم سے اِن نعمتوں کے بارے میں جواب طلبی کی جائے گی۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ایک روایت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حب مال کی حوصلہ شکنی ان الفاظ میں کی ہے:

---

[21] القرآن 10:1تا8

((مَا أُحِبُّ أَنَّ أُحُدًا ذَاكَ عِنْدِي ذَهَبٌ، أَمْسَى ثَالِثَةً عِنْدِي مِنْهُ دِينَارٌ، إِلَّا دِينَارًا أَرْصُدُهُ لِدَيْنٍ، إِلَّا أَنْ أَقُولَ بِهِ فِي عِبَادِ اللهِ، هَكَذَا - حَثَا بَيْنَ يَدَيْهِ - وَهَكَذَا - عَنْ يَمِينِهِ - وَهَكَذَا - عَنْ شِمَالِهِ -.........)) [22]

میں پسند نہیں کرتا کہ اگر میرے پاس احد پہاڑ کے برابر سونا ہو اور تیسرے دن تک میرے پاس ایک اشرفی رہ جائے، سوائے قرض ادا کرنے کے لیے دینار رکھ چھوڑوں۔(یہ کہ میں کہوں گا کہ اس کو ایسے ایسے دائیں، بائیں اور پیچھے بانٹ دو)۔

جہاں بھی مادی ترقی کو اخلاقی اصولوں پر ترجیح دی جائے، مثلاً کسی مجبور کو سود قرض دینا، کوئی ایسا کاروبار کرنا جس سے معاشرے کو کسی بھی طریقے سے نقصان پہنچتا ہو، وہ ناجائز ہو گا۔

طہارت

دین اسلام میں طہارت پر بہت اصرار کیا گیا ہے۔ طہارت سے مراد پاکیزگی ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ابتدائی وحی میں ﴿وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ﴾ [23] میں ہی کا حکم دیا گیا یعنی اپنے کپڑے کو پاک رکھیں۔

یہ واضح رہنا چاہیے کہ اسلام میں پاکیزگی کا تصور محض ظاہری حد تک نہیں ہے، بلکہ اس کی اہمیت باطن کی پاکیزگی پر بھی مشتمل ہے۔ بلکہ قرآن مجید میں جو بعیثتِ انبیا کا مقصد بتلائے گئے ہیں ان میں تزکیہ کو بہت اہمیت دی گئی ہے۔ [24] اسی طرح ایک موقع اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ انھی سے محبت کرتے ہیں جو پاکیزگی اختیار کرتے ہوں۔ قرآن حکیم میں ارشاد ہے:

﴿إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ التَّوَّابِينَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِينَ﴾ [25]

بے شک اللہ بے حد توبہ کرنے والوں سے محبت کرتا ہے اور اچھی طرح پاکیزگی رہنے والوں سے محبت کرتا ہے۔

حدیث نبوی میں بھی طہارت کی اہمیت جامع انداز میں اس طرح بیان کی گئی ہے:

((الطُّهُورُ شَطْرُ الْإِيمَانِ------)) [26]

صفائی نصف ایمان ہے۔

---

[22] **مسلم بن الحجاج القشیری، الجامع الصحیح**، كِتَاب الزَّكَاةِ، بَابُ التَّرْغِيبِ فِي الصَّدَقَةِ، **حدیث**:32۔94، 2:487۔

[23] القرآن 74:4

[24] القرآن 2:129

[25] القرآن 2:222

[26] **مسلم بن حجاج القشیری، الجامع الصحیح**، كِتَابِ الطَّهَارَةِ، بَابُ فَضْلِ الْوُضُوءِ، **حدیث**:1-223، 1:203۔

مذکورہ بالا بحث کے تناظر میں یہ بات بلا تردد کہی جاسکتی ہے کہ سیرت نبوی کی روشنی میں اخلاق کا تیسرا ستون پاکیزگی ہے اور یہ پاکیزگی ظاہری وجسمانی دونوں سطح پر ہونی چاہیے۔ ظاہری ناپاکی کے علاوہ وہ غیبت، بدگمانی، تکبر، فسق اور وہ تمام برائیاں جو ہمارے اذہان کو مادہ پرستی کی غلاظت میں مبتلا کرتی ہیں وہ اسلام کے نظامِ اخلاق کی رُو سے سراسر شر ہے۔ اس ضمن میں اہم اور بنیادی تعلیم حیا کی ہے کیونکہ اس اخلاقی صفت کی بدولت انسان کئی برائیوں سے محفوظ رہتا ہے۔ فحاشی سے گریز اور پاک دامنی بھی درحقیقت اسی اخلاقی خوبی کے مرہون ہے۔ سیرت طیبہ میں ہمیں حیا کے بارے میں جو اخلاقی ہدایات ملتی ہیں، ان کی یہ خصوصیت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی عدم موجودگی کو بھی سے برائیوں کی جڑ یعنی بنیاد قرار دیا ہے، اور اسی اخلاقی صفت کو براہ راست ایمان سے نسبت دی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

((الْإِيمَانُ بِضْعٌ وَسَبْعُونَ شُعْبَةً، وَالْحَيَاءُ شُعْبَةٌ مِنَ الْإِيمَانِ))[27]

ایمان کی بیسیوں شاخیں ہیں اور حیا ایمان کی ایک شاخ ہے۔

ایک اور مقام پر آپ علیہ السلام نے حیا کی تعلیم ہی اسلام کا حُسن قرار دیا ہے۔

((إِنَّ لِكُلِّ دِينٍ خُلُقًا، وَخُلُقُ الْإِسْلَامِ الْحَيَاءُ)) [28]

ہر دین میں ایک خلق ہے اور اسلام کا خلق حیاء ہے۔

انفرادی واجتماعی زندگی میں حیا کا کردار انتہائی اہم ہے۔ اگر لوگ حیا اختیار کرلیں ان کی زندگی بھی پاکیزہ ہو جائے اور پورا معاشرہ بھی صالحیت اور پاکیزگی کی زندہ تصویر بن سکتا ہے۔ لیکن صورت حال اس کے برعکس ہو تو پھر انسان ہر برائی کو اپنے مزاج کا ہی حصہ بنالیتا ہے اور پورے معاشرے کی پاکیزگی کو شطرِ بے مہار کی طرح متاثر کرتا ہے۔ ارشادِ نبوی ہے:

((إِنَّ مِمَّا أَدْرَكَ النَّاسُ مِنْ كَلاَمِ النُّبُوَّةِ، إِذَا لَمْ تَسْتَحْيِ فَافْعَلْ مَا شِئْتَ))[29]

اگلے پیغمبروں کا کلام جو لوگوں کو ملا اس میں یہ بھی شامل ہے کہ جب شرم ہی نہ رہی تو پھر جو جی چاہے وہ کرے۔

چوں کہ بے حیاء لوگوں سے کسی بھی مکروہ وغیر مہذب اور خلافِ شرع کام متوقع ہو سکتے ہیں، اسی لیے اس اہمیت کی بناء پر ایک اچھے اور بااخلاق انسان کی صفات میں حیاء وعفت کا وجود لازم ہے۔

---

[27] **الجامع الصحیح**، کتاب الإیمان، باب شُعَبِ الإیمان، حدیث 35، 1:43۔

[28] ابو عبداللہ محمد بن یزید القزوینی ابن ماجہ، سنن، كِتَابُ الزُّهْدِ، بَابُ الْحَيَاءِ (بیروت: دار احیاء الکتب العربیۃ، 1985ء)، حدیث 4181، 2:1399۔

[29] **الجامع الصحیح**، بابُ حَدیثِ الغارِ، حدیث نمبر: 3483، ص: 4:177۔

نتائج تحقیق

اس تحقیق سے درج ذیل اصول واضح ہوتے ہیں کہ :

- مغرب کے اخلاقی نظریات میں بنیادی خرابی اس کی اضافیت اور انسانیت پرستی کا تصور ہے۔ یہی سبب ہے کہ تہذیبِ نو کے استحصالی نظام میں بے تحاشا خرابیوں کے باوجود اس میں اخلاقی برتری کا مغالطہ بھی موجود ہے جبکہ حقیقتاً وہ نظام دائرہ اخلاق سے بالکل باہر ہے۔
- عدمِ شر وہ پہلا اخلاقی اصول ہے جس کے پیمانے پر ہم نتائج کے اعتبار سے تمام معاملات کو جانچ سکتے ہیں۔ اس اصول کی بدولت ہم اضافیت کے مبہم اور پیچیدہ مسائل سے بچ جاتے ہیں اور اخلاقی اعتبار سے بغیر کسی تشکیک کے درست رویہ اختیار کر سکتے ہیں۔
- دوسرا اصول عدمِ نفاق ہے۔ یعنی جو جیسا ہے اسے ویسا ہی رکھا جائے۔ عدل، امانت داری، دیانت داری، صدق اور تمام اچھائیاں اسی میں شامل ہو جاتی ہیں اور ملاوٹ، کرپشن، بددیانتی اور بہت سی سماجی برائیاں اسی اصول کی زد میں آ جاتی ہیں۔
- تیسرا اور اہم اصول طہارت ہے۔ یہ طہارت جسمانی اور روحانی دونوں جہات پر مشتمل ہے۔
- حسنِ اخلاق بنی نوع انسان کے لیے اللہ رب العزت کا ایک ایسا عطیہ ہے جس کو اپنا کر نہ صرف دنیا کے اندر بہترین کاروبارِ زندگی کا ذریعہ و وسیلہ بنتا ہے بلکہ اُخروی زندگی کی کامیابی کا انحصار بھی اسی حسن اخلاق پر ہے۔ جس کی تصدیق حدیث میں بھی آئی ہے کہ حسن اخلاق سے بڑھ کر میزان میں بھاری چیز کوئی نہیں ہو گی۔[30]
- بنی نوع انسان کی نفسی روح قابل اصلاح ہے اگر صحیح معنوں میں اس کی تربیت کا اہتمام کیا جائے تو انسان کے اندر مثبت تبدیلیاں جنم لے سکتی ہیں۔ اس سے انسان کو فائدہ بھی ملتا ہے اور اس تبدیلی کے مظاہر اس کے گردونواح میں بھی ظاہر ہوتے ہیں۔

---

[30] ابو داود السجستانی سلیمان بن اشعث، **السنن**، کتَاب الْأَدَبِ، بَابٌ فِي حُسْنِ الْخُلُقِ (بیروت: المکتبۃ العصریۃ، 1998ء)، حدیث: 4799، 4:253۔

- حسنِ اخلاق تمام ایسی صفات جو انسان کو فعال ،مفید اور کارآمد بناتی ہیں پروان چڑھتی ہیں ۔ مساوات واخوت، رواداری،احسان، تقویٰ، سخاوت اور باہمی ہمدردی پر عمل پیراہو کر اپنے مفادات کی طرح ہی دوسروں کا مفاد عزیز بن کر خدمت خلق کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔

تجاویز

- عصر حاضر کی اہم ضرورت ہے کہ ہم جدید فلسفہ اخلاق کا تنقیدی مطالعہ کریں اور اس کی بنیادوں میں جو کمزوریاں واقع ہیں انھیں واضح کیا جائے۔
- نسلِ نو اخلاقی معاملات میں انتہائی تذبذب میں مبتلا ہے جسے ختم کرنے کا واحد طریقہ ایک موثر اخلاقی فلسفہ ہے۔قرآن مجید اور سیرت طیبہ میں انسانی حیات کے ہر ایک شعبے کے لیے مکمل فلسفۂ اخلاق تشکیل دیا جائے جس کی مطابق فرد اخلاقی مسائل کا حل دریافت کر سکے۔
- علم نفسیات کی روشنی میں بہت سے اخلاقی امراض جو کہ حقیقتاً نفسیاتی امراض بھی ہوتے ہیں، ان سے گریز کے لیے شعور عام کیا جائے۔